بیسویں صدی میں برصغیر کا عربی ادب

پروفیسر محمد حسان خان

لندن کے ایک سفر میں، برصغیر کے عربی ادب پر ایک لیکچر کی تیاری کے دوران ''اسکول برائے دراسات مشرق و افریقہ'' کی لائبریری کی فہرست میں عربی ادب پر ایک نہایت اہم کتاب نظر آئی، اس کا عنوان دیکھ کر ہی خوشی ہوئی، کیوں کہ برصغیر کے عربی ادب پر یہ کسی عربی کی لکھی کتاب تھی، پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ مصنف نے تنقید وتحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔اس کتاب کا عنوان ہے:''الأدب العربي في شبه القارة الهندية حتى أواخر القرن العشرين ''اس کے مصنف ڈاکٹر احمد ادریس مصری ہیں جو اردو زبان کے ماہر ہیں، مصر، پوری عرب دنیا میں علم ومعرفت اور ثقافت و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس نے اردو زبان کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر بہت پہلے سے اپنی یونیورسٹیوں میں اردو شعبے قائم کر رکھے ہیں، اس وقت پانچ یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو ہیں، فارغ طلبہ کو دو سال کے لئے پاکستان بھیجا جاتا ہے، جہاں وہ اردو زبان میں مزید مہارت پیدا کرتے ہیں، آج اردو کتابوں کا بہت ادبی اور خوب صورت ترجمہ یہ مصری ماہرین اردو کر رہے ہیں، یہ کتاب مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہے:۶ رشارع عباس فہمی سباتس، الھرم، جمہوریۃ مصر العربیہ، یہ بات حیرت انگیز ہے کہ عربی ادب کے ہندوستانی ماہرین اس کتاب سے بے خبر ہیں، حالاں کہ یہ ۱۹۹۳ء میں طبع ہوئی ہے۔

یہ کتاب متوسط تقطیع پر ۴۲۷ صفحات پر مشتمل ہے، کہیں بڑے ابواب ہیں: (۱) نثر (۲) نظم (۳) مشہور ہندوستانی عربی ادباء کی حیات، آخر میں خاتمہ اور حوالے ہیں۔

پہلے باب میں جو''برصغیر کے عربی ادب کی خصوصیات'' سے موسوم ہے، درج ذیل ابواب ہیں: النحو و الصرف، علوم اللغة، المعاجم، علوم البلاغة، الإنشاء والرسائل، المقامات، الطرائف، الأمثال ، الحيل اللفظية اور الترجمات الأدبية۔

دوسرے باب میں جو ''برصغیر میں عربی شاعری کی خصوصیات'' سے معنون ہے، درج ذیل ابواب ہیں:

شعراء من أصحاب الدواوين، شعراء بلادواوين، شروح الشعر، الشعر القصصي والتاريخي، نظم العلوم، العارضات الشعرية، الرسائل الشعرية اور العروض القوافي

ڈاکٹر احمد ادریس بہت دل پذیر انداز میں تمہید باندھتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا جی چاہتا ہے کہ پانچ سو یا ایک ہزار عرب اسکالر برصغیر کے سارے کتب خانے آپس میں تقسیم کرلیں اور ان ہزاروں کتابوں سے دھول جھاڑ کر ان سے استفادہ کریں، جنہیں علماء نے اس وقت تحریر کیا تھا، جب یہ تینوں ملک (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) ایک تھے، بادشاہ اسلام کے نام پر حکومت کرتے تھے اور وہ جلیل القدر علماء جو منوں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں، انہوں نے اسلام پھیلایا، ان کی تھوڑی بہت محفوظ کتابیں ببانگ دہل اعلان کررہی ہیں کہ عربی زبان ہر اس جگہ ہے، جہاں قرآن پاک کا نور پہنچا، اگر قرآن پاک نہ ہوتا تو عربی زبان آباء واجداد کے ساتھ ان کی قبروں میں دفن ہوگئی ہوتی۔''

مصنف نے ان ہندو مالکانِ پریس کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، جنہوں نے عربی واسلامی کتب کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا، چاہے ان کا مقصد تجارت ہی رہا ہو، وہ تحریر کرتے ہیں:

''انہوں نے، جبکہ مشینیں بالکل ابتدائی انداز کی تھیں، چھپائی کے لئے بڑا جوکھم اٹھایا، اسلامی وعربی علوم کی نشرواشاعت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، کوئی بھی شریف اور انصاف پسند شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا۔''

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کے لئے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کی لائبریری کھنگال ڈالی ہے، وہ کہتے ہیں:

''اگر انہوں نے کتاب لکھنے سے پہلے لاہور، ملتان، کراچی، پشاور اور پاکستان کی دیگر لائبریریوں اور رامپور، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور ہندوستان کی سینکڑوں لائبریریوں سے استفادہ کرکے یہ کتاب لکھی ہوتی تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ضخامت کا کیا عالم ہوتا۔''

مصنف نے ادب کے بارے میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے، وہ یہ کہ ادب کیا ہے؟ وہ تحریر کرتے ہیں کہ دورِ قدیم اور دورِ جدید میں بہت سے عرب ومسلم ادباء کے نزدیک جو کچھ عربی میں تحریر کیا گیا، وہ عربی ادب ہے، لیکن اسے قبول کرنا آسان نہیں ہے، پھر ہر مصنف نے کئی کئی کتابیں تحریر کی ہیں، جیسے نواب صدیق حسن خاںؒ (م ۱۳۰۷ھ) نے ۵۶ کتابیں، شیخ عبدالحی لکھنویؒ (م ۱۳۰۴ھ) نے ۸۶ کتابیں، شیخ اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) نے ۱۳ کتابیں لکھی ہیں، تو کس طرح برصغیر کے ہزاروں ادباء پر علمی کام ہوسکتا ہے؟

عربی ادب کا یہ وسیع مفہوم اسلامی ثقافت کا مترادف ہے، اس کی تدوین وتنقید میں عمریں ختم ہوجائیں گی اور یہ تحقیق

کسی ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے، اس لئے مصنف نے اپنی کتاب سے وہ سب خارج کر دیا، جس کا تعلق خالص اسلامیات کے مطالعہ اور رجال وطبقات وغیرہ سے ہے اور اپنی کتاب کو شعر ونثر کے اس حصہ تک محدود رکھا ہے جس کا تعلق عربی زبان وادب اور اس سے متعلق فنون، جیسے نحو وصرف، علم لغت، معاجم، انشاء وبلاغت، مقامات اور امثال وغیرہ ہے، تفسیر میں صرف ابوالفیض فیضی (م۱۰۰۴ھ) کی ''سواطع الالہام'' کو شامل کیا ہے، اس لئے کہ اس میں صنعت اہمال کا استعمال ہوا ہے۔

مصنف نے برصغیر کے ادباء سے ہند وپاک کے عرب ادباء مراد لئے ہیں، وہ ادباء جن کے آباء واجداد عرب ہجرت کر گئے تھے اور وہ وہاں پیدا ہوئے، جیسے ابن اعرابی، ابوالغراف اسلمی، اعشی ہمدان، المنتجع بن نبہان اور کشاجم محمود بن الحسن، ان کو ہندوستانی نہیں مانا ہے، وہ ادباء بھی اس میں شامل نہیں ہیں، جن کا تعلق عربوں سے تھا اور وہ ہندوستان میں کسی بادشاہ یا نواب کے دربار سے جڑ گئے تھے، اسی طرح وہ ادباء بھی اس فہرست سے خارج قرار دیئے گئے ہیں جو کسی دربار میں رہے، پھر یہیں قیام کر لیا، وہ عرب ادباء بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہیں، جو یہاں کچھ مدت رہے، جیسے البحتری، ذوالرمۃ، منصور بن حاتم الخوی وغیرہ، مصنف نے صرف ان ادباء کو شامل کیا ہے جن کی اصل ہندوستانی ہے، جو یہیں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، چاہے بعد میں وہ عرب چلے گئے ہوں، جیسے صغانی، مرتضیٰ الزبیدی وغیرہ۔ (یہ حد بندی اور تقسیم صرف فنی ہے تاکہ برصغیر کا ادب بالکل ممتاز کیا جاسکے)۔

برصغیر کے ادب کی خصوصیات:..... ہر ادب کی کچھ بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں، جن سے وہ پہچانا جاتا ہے، مصنف کتاب نے پورے ایک باب میں ان خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔

پہلی خصوصیت:..... اس ادب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسا ادب ہے جس میں عربوں نے براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا اور ہندوستانیوں نے اس کو عربوں سے بلاواسطہ حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنی طرح دوسرے عجمیوں سے لیا ہے، یہ عربی ادب ایرانیوں سے اخذ کیا گیا ہے، برصغیر کے عربی ادب کی یہ سب سے اہم خصوصیت ہے۔

اس کی تاریخی تفصیل یہ ہے کہ سندھ میں عربوں کی فتوحات وغزوات کے وہ اثرات نہیں ہوئے جن کا ذکر مؤرخین نے بڑے مبالغہ سے کیا ہے، عرب وہند کے تعلقات اسلام سے بہت پہلے سے تھے، مؤرخین نے اس سے اہمال برتا ہے، جب ان تعلقات پر قلم اٹھایا تو اس کو شرک اور کفر وفسق سمجھا، اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس دور کی تاریخ ضائع ہوگئی اور ادب پر تاثیر اور تاثر واضح نہ ہوسکا، مصنف اس کی مزید تفصیل جاننے کے لئے عربوں کی قدیم تاریخ کا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہیں۔

اس طرح مؤرخین نے مبالغہ سے کام لے کر اسلام سے پہلے کے دور کو برا ثابت کیا اور اس دور کی اچھائیوں سے اعراض کیا، عربوں اور دیگر اقوام کے قدیم تعلقات کو چنداں اہمیت نہیں دی، جنگ وغزوات کے ذکر میں بھی مبالغہ سے

کام لیا، محمد بن قاسم کے غزوۂ سندھ کے بارے میں بھی اسی طرح مبالغہ سے کام لیا ہے، اس کی طرف یہ بات منسوب کی کہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی اور عربی زبان کو رائج کیا، مثال کے طور پر عبدالمنعم النمر کی ''تاریخ الإسلام في الهند ''مطبوعہ مصر ۱۹۵۹ء، بلاذری کی ''فتوح البلدان ''مطبوعہ لیدن ۱۸۶۶ء، ڈاکٹر جمیل احمد کی ''حركة التأليف باللغة العربية ''اور قاضی اطہر مبارک پوری کی تالیفات کا آپ مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

حجاج، جس نے لاکھوں مسلمانوں کا قتل کیا، اس کو دین کی پروا تھی، نہ شریعت کی، اس کو بیرون عرب اسلام پھیلانے کی کیا فکر ہو سکتی ہے؟..... حجاج کے احوال کے لئے ابن کثیر کی ''البداية والنهاية ''مطبوعہ بیروت ۱۹۸۸ء کا مطالعہ بہت مفید ہے، محمد بن قاسم کا رویہ سندھ میں ایک داعی کا رویہ نہ تھا، جس کا مقصد اسلام پھیلانا ہوتا ہے، روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سندھ پر حجاج کا حملہ اسلام اور عربی زبان اور تہذیب کی نشر واشاعت کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد بنی ہاشم کے بھاگے ہوئے لوگوں کا پیچھا کرنا اور انہیں پکڑنا تھا۔(۱)

خود اموی سلطنت کی پالیسی اسلامی نہ تھی، عربوں کو عجمیوں پر فضیلت دی جاتی تھی، اس لئے بیرون اور اندرون خلافت عجمیوں کے دل اموی حکومت سے دور تھے۔ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چند عرب خاندان: المہابیۃ سنجان میں، الھباریۃ منصورۃ میں، السامیۃ ملتان میں، العدانیہ مکران میں اور المحلبۃ قصدار میں جا کر آباد ہو گئے، جیسا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں اسلام کی نشر واشاعت کے نتیجے میں عربی زبان کی اشاعت بہت کم ہوئی، بلکہ اس کے دیگر اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض حکمرانوں نے، جیسے نویں صدی میں ساحل مالا بار کے شاہ زامورین نے، مسلمانوں کی طاقت ور حکومت سے دوستی کے ذریعے اپنے مفادات کی حفاظت چاہی، اس نے اپنے ملک کے تمام مچھلی پکڑنے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے بچوں میں سے ایک یا دو کی اسلامی طریقہ پر پرورش کریں۔(۳)

ممکن ہے یہ طریقہ ہندوستان کے دیگر بادشاہوں نے بھی اپنایا ہو۔ جیسا کہ چھوٹی مملکتیں بالعموم بڑی اور عظیم طاقتوں سے تعلقات کے لئے کرتی ہیں۔

اسلامی مملکت کی اٹھان اور ترقی کے زمانہ میں ہندوستانی حکومت میں ضعف واضمحلال آ گیا تھا، کیوں کہ اس وقت ہندو، بدھ اور جینیوں کے درمیان لڑائی جھگڑا برابر جاری تھا، سوسائٹی منقسم ہو چکی تھی، یہ لوگ اپنے مذہب سے بے زار اور کسی نئے دین کی تلاش میں تھے اور وہ اس عظیم الشان خلافت کے دین کو جاننا چاہتے تھے جس کے بیچ میں سمندر حائل ہے اور اس طرف جانے والے اچھی اچھی خبریں لاتے ہیں۔(۴)

اسلام اور عربی زبان کی اشاعت کے دو اہم اسباب اور بھی ہیں: ان میں سے ایک ہے فارس اور ماوراء النہر کے علماء و

فضلاء کی سکون واطمینان کی تلاش میں بڑے پیمانہ پر ہجرت۔

عباسی خلافت کی کمزوری کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور نوابیوں کا قیام اور پھر خلافت عباسیہ کے سقوط، بغداد کی تباہی، اسلامی ثقافت کی بربادی اور اسلامی علوم اور اسلامی تصنیفات کی ناقدری کے بعد علماء کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کر جائیں، یہ مملکتیں گیارہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک قائم ہوتی رہیں، جن میں سے بعض بڑی زبردست اور علم وعلماء کی قدرداں تھیں، جیسے غزنوی، غوری اور مغل سلطنتیں، ان ممالک میں بڑے بڑے دینی مدرسے قائم ہوئے، جہاں طلبہ نے علم دین حاصل کیا۔

دوسری وجہ بلاد فارس کے علم ومعروفت کے شیوخ اور اساطین کی آمد ورفت ہے، پانچویں صدی ہجری میں غزنوی سلطنت کے زمانے سے پندرہویں صدی تک یہ اساطین برابر ہندوستان کی سیاحت کرتے رہے، شیخ ہجویریؒ، شیخ اسماعیل بخاریؒ، فرید الدین عطارؒ، معین الدین چشتیؒ، جلال الدین تبریزیؒ، جلال الدین بخاریؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، عبدالکریم جیلیؒ جو ابن عربیؒ کے شاگرد تھے، میر شاہ جیلانیؒ، بہاء الدین زکریاؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، جلال الدین سرخ پوشؒ وغیرہ۔(۵)

برصغیر میں عربی ادب پر عربی زبان کے براہ راست اثرات جنوبی ہند میں ساحل مالابار پر ہوئے ہیں، جہاں حجاج کے ظلم سے بھاگ کر چند عرب خاندان آباد ہوگئے تھے، بعد میں عہد عباسی میں تاجروں کے قافلے پے در پے آتے رہے اور اپنے اثرات ڈالتے رہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس تاثیر کے حوالے ہم تک بہت کم پہنچے ہیں، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس سلسلے کے بھرپور مراجع اور حوالے علاقائی زبانوں میں نہ ہوں گے، کوئی دیدہ ور اسکالر چاہے تو انہیں تلاش کرسکتا ہے، یہاں جس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ مالابار کے ادب کے نمونے عربی تاثیر کے اجتماعی نمونے ہیں، جن کا مطالعہ ایک ادبی مظہر اور نمونے کے طور پر کیا جاسکتا ہے، برخلاف شمالی برصغیر کے، جہاں اغلب عربی ادب فارسی ثقافت سے متاثر ہے، اس کے باوجود عربی کا بلاواسطہ اثر انفرادی حیثیت میں پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں جن کو عموماً عربوں کے ماحول اور سوسائٹی میں رہنے کا موقع ملتا ہے، ان کا اسلوب دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، جیسا کہ نثر پر گفتگو کرتے وقت یا رضی الدین صغانی، مرتضیٰ زبیدی اور عبدالعزیز میمن پر کلام کرتے ہوئے ہم بتائیں گے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ تاثیر حالات کے مطابق ہر فرد میں علاحدہ پائی جاتی رہی ہے، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شمال کے ادباء کی تخلیقات پر عموماً فارسی اثرات غالب رہے، جب کہ جنوب کے اغلب ادب پر عربی ادب کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

خود ہندوستانی اور یورپی علماء اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام اور عربی زبان وادب نے فارس کے راستے سے ہند کے بڑے حصہ پر قبضہ کیا۔ عبداللہ مبشر الطرازی کہتے ہیں:

''عربوں کا ہند پر پہلا بحری حملہ عمر بن اخطابؓ کے عہد میں عثمان بن ابی العاص کی سرکردگی میں ہوا۔ یہ حملہ خلیفہ کے حکم کے بغیر ہوا، اس لئے حضرت عمرؓ بہت ناراض ہوئے، بعد میں انہوں نے ہند فتح کرنے کی اجازت زمینی راہ سے یعنی براہ فارس دے دی۔''(۶)

مولانا عبدالحی حسنی تحریر کرتے ہیں: ''ہندوستان میں اسلام خراسان اور ماوراء النہر سے آیا اور وہیں کی علمی شعائیں ہندوستان پر پڑیں۔''(۷)

گوستاف لوبون کہتے ہیں: ''پہلے مسلمان حملہ آور افغان، ترک اور مغل تھے، عرب جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اول متبعین میں سے تھے، انہوں نے ہندوستان میں اپنی کالونیاں قائم نہیں کیں، اکثر اپنے ملک سے بحر عمان پار کر کے تجارت کی غرض سے ہندوستان آتے اور اپنے اسٹور قائم کرتے اور مغربی ساحل پر، جہاں نہر سندھ سمندر میں ملتی ہے، لوگوں کی املاک پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں''۔(۸)

ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوستان میں درحقیقت وہ عرب تہذیب منتقل کی جس میں فارس کے عوام کے اختلاط کی وجہ سے بعض تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں اور مسلمانوں نے اپنے ہاتھ ہندوستان میں قدیم عرب ملکوں کی سیاست بھی داخل کی، جس میں اچھائیاں بھی تھیں، ساتھ میں ایسی برائیاں بھی تھیں، جس سے تہذیب کو زوال آتا ہے۔

یہ جملۂ معترضہ ہم نے اس لئے پیش کیا کہ مطالعہ کرنے والوں کے درمیان یہ بات عام ہے کہ محمد بن قاسم نے برصغیر میں عربی زبان اور اسلام پھیلایا، یہ بات صحیح نہیں ہے، عربی زبان، عجمیوں کے ذریعہ، جب انہوں نے اسلام پھیلایا تو پھیلی ہے، اس حقیقت کی وضاحت ہم نے یوں بھی ضروری سمجھی کہ آئندہ صفحات میں ہمیں برصغیر کے عربی ادب کی خصوصیات پر گفتگو کرنی ہے، ہم کو اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ اس ادب کی کیا اہمیت ہے؟ کن چیزوں نے اس پر اثر ڈالا ہے؟ عربوں کو اس بات کی بہت قدر دانی ہے کہ یہ ادب خالصاً عجمیوں کا تخلیق کردہ ہے، جس میں عربوں کا کوئی اثر نہیں۔

مصنف عربوں کے طریقۂ انصاف کے مطابق بڑی اچھی بات تحریر کرتے ہیں۔ عربوں سے زیادہ مستشرقین اور ہندوؤں نے عربی زبان اور اس کی کتابوں کو عام کیا، منشی نول کشور ایک ہندو شخص ہے، جس نے تقریباً چار ہزار کتابیں چھاپیں، جن میں سے اکثر عربی اور فارسی کی ہیں۔

جس شخص کو ان حقیقتوں کی تلاش ہو، اس کو ڈاکٹر احمد خان کے مقالہ ''برصغیر میں عربی کتب عام کرنے میں علماء کا حصہ'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، اس مقالہ میں موصوف نے ہند میں طباعت کی ابتداء، مستشرقین کے کارناموں اور ہندو پاک کے علمی اداروں نے عربی ثقافت کو پھیلانے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ مقالہ کویت کے بین الاقوامی میلے میں نومبر ۱۹۹۳ء میں پڑھا گیا تھا۔ (ڈاکٹر احمد خان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ احیاء ثقافت

اسلامی کے ڈائریکٹر ہیں۔

ادباء میں سے بعض نے بلاتکلف فارسی کو واسطہ بنایا ہے، محمد زمان خان (م۱۹۹۲ء) اپنی کتاب ''سفينة البلاغة في صناعة الإنشاء والرسائل '' کے مقدمے میں کہتے ہیں: ''میں نے جہاں ضرورت محسوس کی، ترتیب کلام بدل دی اور بعض کو مقصد حاصل کرنے کے لئے مختصر کر دیا، اسی طرح میں نے بعض مطالب کو فارسی سے نقل کیا اور یوں میں فارسی اور عربی دانوں کے بیچ میں ترجمان بن گیا۔''(۹)

بعض ادباء ایسے ہیں، جنہوں نے فارسی نظم کو عربی نظم سے ملا دیا ہے، جیسے محمد عباس تستری (م۱۳۰۶ھ) نے اپنے منظومہ ''اجناس الجناس'' میں اور احمد رسول پوری (م۱۳۵۹ھ) نے کیا ہے۔

بعض ادباء وہ ہیں، جنہوں نے فارسی محسنات و بدائع نقل کئے ہیں اور وہ ان سے بہت متاثر ہیں، یہاں تک کہ ان کے شعر عربی زبان اور عربوں کے مزاج کے بالکل خلاف ہو گئے ہیں، جیسے غلام علی آزاد بلگرامی (م۱۲۰۰ھ)(۱۰)

ہندوستان کے ماحول و ادب پر فارسی کا کتنا زیادہ اثر ہے، اس کا اندازہ ہم استاذ احمد کلچین کی کتاب ''کاروانِ ہند'' سے، جو دو بڑے حصوں میں چھپی ہے، کر سکتے ہیں، اس میں انہوں نے ان فارسی شعراء کی ایک فہرست پیش کی ہے، جو صفوی دور میں ادب سے دلچسپی میں کمی اور دیگر نامناسب حالات کی وجہ سے ہندوستان ہجرت کر گئے تھے، اس فہرست میں آٹھ سو شعراء کا نام درج ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران کے ادباء و علماء کی ہجرت کا برصغیر پر بہت زیادہ اثر پڑا ہے، عربی زبان و ادب کے پھیلنے کا یہ بڑا سبب ہے، یہ بات عرب علماء و ادباء کو حاصل نہ تھی، کیوں کہ وہ اس علاقہ سے کٹے ہوئے تھے، اس لئے عام طور پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت: برصغیر کے عربی ادب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلامی مطالعاتی مراکز اور دینی مدارس کے درمیان پروان چڑھا ہے، اسی لئے ہم ان ادبی کتابوں کی تحریر کردہ شرحیں دیکھتے ہیں جو علماء نے ادب میں مقرر کر رکھی تھیں، جیسے ''معلقات، ديوان المتنبي، مقامات الحريري، المطول، الكافية، الشافية، ديوان الحماسة، قصائد البردة وبانت سعاد اور ألفية ابن مالك'' حالاں کہ بدیع الزماں جیسا بلند پایہ ادیب محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا، اس کی شہرت ہوئی، اس کے رسائل و مقامات علماء و ادبا کی نظروں کے سامنے تھے، ان کا انتقال ۳۹۸ھ میں ہوا، اس کے مقابلے میں حریری بہت بعد کے ہیں، ان کا انتقال ۵۱۶ھ میں ہوا، ان کا بہت چرچا ہے، لیکن بدیع الزماں کے مقامات، اشعار یا رسائل ہندوستان کے عرب ادباء کے درمیان کوئی مقام نہ پا سکے، حالاں کہ ان کے مقامات حریری سے بہت بہتر ہیں، رسائل میں نیا پن ہے اور اشعار میٹھے ہیں، اس کی کوئی شرح نہیں لکھی گئی، صرف ایک شرح کا ذکر سید عبدالحی حسنی نے ''الشفافة الاسلامية '' میں کیا ہے، جس کا نام ''الياقوت الرماني بشرح مقامات الهمداني'' بتایا ہے، یہ صرف اس لئے کہ ہمدانی کی کتاب کورس میں داخل نہ تھی۔

ہندوستانی عربی ادب مدارس کے اردگرد پروان چڑھا ہے، اس لئے وہ ادباء، جو خالص اصنافِ ادب پر قلم اٹھاتے ہیں، وہ بھی اپنے مقدموں میں اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ دین کی خدمت ہے، یا کتاب کے موضوع کو کسی نہ کسی طرح دین سے جوڑتے ہیں، مثال کے طور پر صدیق حسن خان القنوجیؒ (م ۱۳۰۷ھ) اپنی کتاب ''نشوة السکران من صهباء تذکار الغزلان'' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''ہم تعریف بیان کرتے ہیں، اس کی جس نے صبیح چہروں کو نرگسی آنکھیں اور گلابی رخسار عطا کئے اور مناسب قدوں کی ٹہنیوں پر انار اگا دیئے اور ایک ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جو خود کو خواہشات نفس وہویٰ سے دور رکھتا ہے اور اپنے محبوب کی تشبیب کرتا ہے اور صلاۃ وسلام ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام پر.....اس کتاب میں عشق وعشاق اور معشوقات کا ذکر ہے۔''(۱۱)

احمد رسول پوری کے دیوان کے مقدمے میں تحریر ہے:

''یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ علم عربی تمام اسلامی علوم میں افضل ہے اور مسلمان عرصۂ دراز سے کوشش کررہے ہیں کہ عربی زبان کو عام کریں اور کیوں نہ ہو کہ اسلام اور عربی زبان کے درمیان ایسا تعلق ہے، جس سے علم دین وشریعت کا چاہنے والا بے نیاز نہیں رہ سکتا۔''(۱۲)

تیسری خصوصیت:.....اس ادب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ شاہی ادب ہے جو بادشاہوں کے دربار میں پروان چڑھا ہے، اس لئے وہ عام لوگوں سے کٹا ہوا ہے، سلطان کی تعریف اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ نوازتا ہے، جب وہ یا اس کا کوئی عزیز مرتا ہے تو مرثیہ کہا جاتا ہے، رہے غرباء فقراء، مساکین اور سوسائٹی کے عام لوگ، تو ان کا اس ادب میں کوئی تذکرہ نہیں۔(۱۳)

ادبی تحریک، ہند کے مختلف شہروں میں سلاطین اور ریاستوں کے حکمرانوں کے اردگرد گھومتی ہے، جب ملتان علم کا مرکز تھا تو وہاں بہت سے علماء پیدا ہوئے، پھر جب غزنویوں کے زمانہ میں لاہور پایۂ تخت بنا تو وہ مرکز علم وفن بن گیا، جب غوریوں نے دلی فتح کرلیا اور اس کو مفتوحہ ہندوستان کی راجدھانی بنایا تو وہ تیموری سلطنت کے خاتمے تک علماء کا ملجا وماویٰ بنی رہی، گجرات، دکن، جون پور، لکھنؤ اور اودھ اور اس کے علاقے بلگرام، ہرکام، جائس، کاکوری، خیرآباد وغیرہ کا بھی یہی حال ہے، کوئی بھی سلطان مخالفانہ بات یا تنقید سننے کا روادار نہیں تھا، سلطان کی خواہشات وتصرفات، جو دین اسلام کے سراسر خلاف تھیں، اگر علماء ان پر تنقید کرتے تو ان کی بے عزتی ہوتی اور اہمیت گھٹ جاتی اور جو مخالفت نہ کرتے، وہ عیش وآرام سے رہتے، ہندوستان کے اکثر بادشاہوں اور نوابوں کی سیاست واعمال میں دین کو بہت کم اہمیت حاصل تھی، بلکہ وہ اکثر معاملات میں شریعت کی مخالفت کرتے تھے۔

شیخ احمد سرہندیؒ کے رسائل، جو انہوں نے اپنے متبعین کو لکھے، وہ سوسائٹی اور ان لوگوں کی سیاست کی پول کھول دیتے

ہیں، جو دین کے نام سے حکومت کرتے تھے، وہ اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''افسوس وحسرت، ہائے مصیبت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو خدا کے محبوب تھے، ان کے متبعین اس ملک میں اجنبی بن گئے ہیں، انہیں بے عزت کیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی عزت ہے، باطل ظاہر وغالب ہے، حق بے عزت اور مستور ہے۔''

دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمانوں پر اس ملک میں ایسا وقت آیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شریعت پر عمل کرے تو اس کو جیل کی سزا ہوتی ہے اور اس کی بے عزتی کی جاتی ہے، دوسرے تمام مذاہب آزاد ہیں، دشمن مسلمانوں کی شماتت کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔'' (۱۴)

ان تمام واقعات نے علماء وادباء کے دلوں کو نہیں گرمایا، ہم ان تمام حادثات وواقعات کے لئے اس عہد کے ادب میں، نہ نثر میں، نہ شعر میں، ایک حرف نہیں پاتے ہیں، اس لئے کہ یہ سلطانی ادب ہے، سلطان جانتا ہے کہ ادباء کو کیسے خوش کیا جاتا ہے، شاہ جہاں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دوبار چاندی میں تولا اور قاضی محمد اسلم الہروی کو ایک بار سونے میں تولا، سلاطین کے دربار کے علماء وادباء کے ساتھ یہی طریقہ جاری رہا، ایک طرف یہ سونا اور چاندی علماء کو عطا کیا جاتا تھا، دوسری طرف اسی شاہ جہانی دور میں ملک میں زبردست قحط پڑا، لوگوں نے علماء کے فتوے سے اپنے بچوں کو ذبح کر کے کھایا۔ (۱۵) اسی شاہ جہاں کے دور میں پرتگالی ہندوستان میں داخل ہوئے، ان کے تاجروں نے ملک پر قبضہ کر لیا اور عیسائی مشنریوں کا خطرہ بڑھ گیا۔ (۱۶) اس طرح کے اہم اور افسوس ناک واقعات نے ادباء کے احساس کو نہیں چھیڑا، ان کا ادب دربار کا قیدی بنا رہا، دربار سے باہر اس کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اگر کچھ نظر آجاتا تو اس پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا تھا۔

اس کے مقابلے میں دوسری مشائخ تصوف اور اہل عرفان صوفیا تھے، جنہوں نے ہر عہد حکومت میں اپنی علاحدہ حکومت قائم کر رکھی تھی، لیکن سلاطین نے ان کے ساتھ دوسرا سلوک کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بیان کیا ہے کہ ''سید آدم بنوریؒ مدفون بقیع کے دسترخوان پر ایک ہزار آدمی روز کھانا کھاتے تھے، ان کی معیت میں ہزاروں لوگ اور سینکڑوں علماء چلتے تھے، جب سید ۱۰۵۳ھ میں لاہور میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ دس ہزار اشراف ومشائخ تھے، یہاں تک کہ شاہ جہاں خوفزدہ ہوا اور ان کو رقم بھیجی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر حج فرض کیا ہے، آپ حجاز چلے جائیں، وہ بادشاہ کا مقصد سمجھ گئے اور حرمین چلے گئے، جہاں ان کا انتقال ہوا۔'' (۱۷)

ہندوستان کے سلاطین نے جو کچھ مخالف علماء کے ساتھ برتاؤ کیا، اس کا ایک دلچسپ خاکہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' میں کھینچا ہے، یہ کتاب بہت دلچسپ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہانِ ہند اپنے مخالف، پاک صاف فطرت والے، علم میں مشغول، سلاطین و

حکام کے مددگار، نفع اٹھانے والے، حق بات ہمت کے ساتھ کہنے والے اور تنقید کرنے والے علماء کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔(۱۸)

چوتھی خصوصیت:..... برصغیر کے ادب نے تہذیبی گہرائی کا عکس پیش نہیں کیا، ان کی سرزمین پر فارس کی وسیع تہذیب اور ہندوستان کی سرسبز تہذیب کا ملاپ ہوا تھا، ادباء کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ فارس کے خیالات اور شعری ونثری متنوع موضوعات سے استفادہ کرتے اور ہندوستانی آداب، اس کے وسیع خیالات اور منثور ومنظوم تخلیقات کے ساتھ اس کی پیوندکاری کرتے، اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے لئے نہایت حسین وجمیل ادبی افکار ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے پیش کر سکتے تھے، اس لئے کہ وہ بہت اچھی فارسی جانتے تھے، اس سے پوری طرح وابستہ تھے، اس کے جلو میں جیتے تھے اور اس زبان میں شعر کہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ داستان، ناول، نثر وشعر تہذیبی ادب سے بالکلیہ معدوم ہوگئے، ان کے لئے ممکن تھا کہ تاریخی روایات نظم کرنے میں مثنوی کے فن سے اور عشقیہ قصے لکھنے میں ہندوستان کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے، جہاں اس طرح کے قصے بھرے پڑے ہیں اور فارسی ادب میں بھی ان کا بہت رواج ہے، اسی طرح انہوں نے حیوانات کی زبانی قصوں کا فن، جو ہندوستانی اور فارسی ادب میں رائج ہے، اس کو مٹادیا۔ ایک کتاب بھی ''کلیلة ودمنة'' کی طرح اس موضوع پر نہیں لکھی گئی، مولانا عبدالحی حسنی نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ وہ کتاب پائی نہیں جاتی، انہوں نے مؤلف کا نام تک نہیں لکھا، بلکہ تحریر فرمایا ہے کہ بعض بوہروں کے یہاں ایسے قصے پائے جاتے ہیں۔

پانچویں خصوصیت:..... برصغیر کے ادب کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایتی موضوعات پر شعر کہے جاتے ہیں، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نعت، سلاطین وامراء اور دوست واحباب کی تعریف وتوصیف یا مرثیہ اور زہد وعرفان۔ یہ بنیادی موضوعات برصغیر کی عربی شاعری کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، مگر بعض شعراء کے یہاں دیگر موضوعات بھی پائے جاتے تھے، جیسے شیخ فیض الحسن سہارن پوری نے بیسویں صدی میں ایک شہر کی ہجو کی ہے، انہوں نے ایک چور کے ان کے گھر میں داخل ہونے کے بارے میں اپنے احساسات درج کئے ہیں، انہوں نے اس واقعہ کا وصف بیان کیا ہے۔

موضوعات کے انتخاب میں روایت کی پابندی نے تجدید کے عمل کو معطل کر دیا ہے، اشعار کی شکل میں تو اس سلسلے میں شعراء نے کوششیں کی ہیں، جیسے محمد عباس تستری، جنہوں نے مثنوی سے استفادہ کیا ہے، یا آزاد بلگرامی، جنہوں نے فارسی اردو نظم کے ڈھانچہ یعنی غزل گوئی کو عربی میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کے ذریعے عربی معنی ومفہوم کا احاطہ کر سکیں، مستزاد ترجیع بند ڈھانچہ، مخمسات اور مسدسات کی طرح ہیں، جو کہ عربی کے دور انحطاط میں پیدا ہوئے، جیسے فارسی وزن پر رباعیات جس پر محمد افضل فقیر اور ڈاکٹر خورشید رضوی نے نظم کہی ہے، یہ دونوں جدید شاعر ہیں۔

لیکن ان لوگوں کی یہ کوشش شہرت نہ پاسکیں، اس لئے کہ انہوں نے اردو یا فارسی کے خالص اوزان استعمال کئے، جنہیں عرب نہیں جانتے تھے، کامیابی صرف ڈاکٹر رضوی کو ملی، تجدید ادب کی فصل میں، مصنف کتاب نے ان کی تعریف کی ہے، مختصر یہ کہ برصغیر کے ادباء نے عربی ادب کے موضوعات میں تجدید کرنے کے بجائے ڈھانچوں، اوزان اور اشکال کی تجدید پر زور دیا۔

چھٹی خصوصیت:.....اس ادب کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک متعین تاریخی زمانہ سے متعلق ہے، جس میں مسلمانوں کو ہندوستان میں اقتدار حاصل تھا، لیکن جب ان کی کمزور حکومتیں بھی ختم ہوگئیں اور انگریزوں نے ملک پر قبضہ کرلیا تو عربی ادب انحطاط کا شکار ہوگیا اور صرف دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم باقی رہ گئی، جس کا کوئی خاص فائدہ نہیں، زبان سیکھنے کا مقصد عرب ملکوں میں جاکر کام تلاش کرنا رہ گیا، وہاں کے ادب سے فائدہ اٹھانا اور نیا ادب تخلیق کرنا خواب وخیال کی باتیں ہوکر رہ گئیں۔ اس لئے کہ انگریزی علم وفن اور تہذیب کی زبان قرار پائی، فارسی اور عربی اور ان سے مربوط زبانیں اور ان کا ادب ختم کردیا گیا۔

ساتویں خصوصیت:.....اس ادب کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ترقی فطری انداز سے نہیں ہوئی، ادب کا پیدا ہونا اور ترقی کرنا فطری انداز سے ہونا چاہئے، پہلے اکھوا نکلے، پھر کمزور تناوجود میں آئے، پھر اس کی ٹہنی مضبوط ہو، پھر پھل آئے، پھر مرجھا جائے، اس وجہ سے ہم برصغیر کے عربی ادب کے مختلف ادوار کی خصوصیات میں امتیاز نہیں کرسکتے، جیسا کہ کسی بھی ادب پر گفتگو کے وقت ہوتا ہے، لفظی صنعت میں استغراق ابوالفضل بن مبارک کے یہاں ۱۰۰۴ھ میں پایا جاتا تھا، بالکل وہی چودھویں صدی ہجری مین محمد عباس تستری کے یہاں نظر آتا ہے اور ہو بہو فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ) کے یہاں تیرہویں صدی میں دکھائی دیتا ہے، ابوالفضل بن المبارک ''سواطع الالہام'' کے بارے میں رقمطراز ہیں:

صراح لأصل الأصل طرس مطهر — سواء لكل الكل علس مطهم
إمام همام للكلام مؤول — صلاح سريد لسلام مسلم
مدار مراد للمدارك مطرح — ملاك كلام للمعلم معلم

مفتی محمد تستری کہتے ہیں:

لطفت لنا و أنزلت الكتابا — وتغفر أن يكن ذو الشرك تابا
هو المولىٰ ونحن له عباد — ومن سلكوا خلاف الشرع بادوا
يكرم بالعطايا من أتاه — ومن يجحد بنعمته فتاهوا

علامہ فضل حق خیرآبادی فرماتے ہیں:

فـؤادي هـائـم والـدمـع هـامـي　　وسهـري دائـم والـجـفـن دامـي

وقـلـب مـافـتـى بـجـوى ودلـوع　　ولـوع فـي اضـطـراب واضـطـرام

آپ ان مثالوں کوملاحظہ فرمائیں، صرف لفظی صنعت کا زور ہے، اسی طرح ہم آسانی سے عبدالحکیم سیالکوٹی (م۱۰۶۷ھ) الصغانی (م۶۵۰ھ) یا عبدالرحیم صفی پوری (م۱۲۷۶ھ) کے اسلوب کوعہدوں اور ادوار میں تقسیم نہیں کر سکتے۔(۱۶)

اس کا سبب مصنف کی نظر میں یہ ہے کہ برصغیر کا ادب اپنی عظمت اور بلندی کے باوجود اجنبی ماحول میں بوئے گئے درخت کی طرح ہے، اس لئے اس کی ترقی غیر فطری ہے، اگر ہم کسی غیر مناسب جگہ درخت لگائیں تو ان میں سے دو چار درخت پھل دے دیں گے، لیکن اکثر سوکھ جائیں گے، یا ان کا تنا کم زور، ٹہنی بے کار یا پھل کڑوا ہوگا، یہی معاملہ برصغیر کے عربی ادب کا ہے، ادباء کی تخلیقات ہر ایک کی اپنی اصلاحیت، مزاج اور ادبی احساس کی غماز ہیں، اساتذہ کا ماحول تعلیم سے جڑا ہوا ہے اور عہدوں اور ادوار کا ان کی تخلیقات میں کوئی دخل نہیں ہے، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر کی رائے ہے کہ اس ادب کے انحطاط میں ان خصوصیات کا بڑا دخل ہے اور ان کے علاوہ دیگر عوامل واسباب بھی ہیں، اپنے مقالہ ''برصغیر میں عربی شاعری کے ابتدائی نقوش'' میں وہ ان اسباب کا یوں ذکر کرتے ہیں:

(۱)......''عربوں کی سیاسی قوت ختم ہوگئی، سندھ اور ملتان میں عربی حکومت نہ رہی، سیاسی قوت پر زبان کا دارومدار ہوتا ہے، اسی بناء پر سندھ میں دربار کی زبان عربی تھی اور تخاطب اور بازار کی بھی، عباسی خلافت کے انحطاط وزوال کے سبب حکام اور والیوں نے بغداد کے خلیفہ سے قوت وطاقت کا حصول ختم کر دیا تھا، بلکہ حکومت اس کی تھی جو غالب آ گیا، جس نے قبضہ کر لیا، یہ انتشار واضطراب مضبوط غزنوی حکومت سے پہلے ان علاقوں میں پورے زوروشور سے جاری تھا، جن سے مل کر اب پاکستان بنا ہے۔

(۲)......عرب حکومت کے خاتمے اور قابض حکمرانوں کے بعد عرب خطے کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں سے برصغیر کا ناتا بالکلیہ ٹوٹ گیا، بلکہ ان حکمرانوں نے دونوں طرف کے لوگوں کے ملنے جلنے پر پابندی لگادی اور براہ راست ثقافتی تعلق ایسا منقطع ہوا کہ آج تک بحال نہ ہوسکا۔

(۳)......عربی ادب کو جنوبی ایشیا میں پھیلنے سے پرتکلف اسلوب نے روکا، جو سجع، قافیہ اور اجنبی اور نامانوس کلمات سے لبریز تھا اور بدیع الزماں ہمدانی اور ابوالقاسم الحریری اور ان کے متبعین کا تھا، یہ پرتکلف، بوجھل اور بانجھ اسلوب عربی اور اس کے مستقبل کے لئے، جو اکیلے پورے عالم اسلام کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہایت درجہ نقصان دہ تھا، اگر یہ ظلم عربی زبان کے ساتھ نہ کیا گیا ہوتا تو آسان سہل اور شیریں فارسی نے کبھی عربی کی جگہ نہ لی ہوتی اور اگر فارسی ایران اور اس کے پڑوسی علاقوں میں نہ اختیار کر لی گئی ہوتی تو عربی ہی تنہا اسلامی تہذیبی زبان ہوتی۔''

آخر میں ڈاکٹر احمد ادریس بڑی دل سوزی سے کہتے ہیں:

''برصغیر میں عربی کی خدمت کرنے والے خود اپنا راستہ بھول گئے، سوائے بانجھ اور پر تکلف اسلوب کے ان کے سامنے کچھ نہ تھا، وہ الفاظ سے کھیلنا اور اس کا تعویذ بنانا جان گئے تھے، بہت عرصے تک اس سے کھیلتے رہے، جب ان کے بس میں یہ کھیل نہ رہا تو وہ حیرت زدہ ہو کر اس عدیم الفائدہ اسلوب کو دیکھتے رہے اور آج تک دیکھ رہے ہیں۔''

عربی زبان وادب پر برصغیر میں اس کے بعد سب سے خطرناک مرحلہ اس وقت آیا، جب وہ تکلف وتصنع والی عربی لکھنے پر بھی قادر نہ رہے، اس وقت انہوں نے عربی کو سنسکرت، یونانی اور لاطینی جیسی مردہ زبانوں کی طرح پڑھانا شروع کر دیا، عربی کے اساتذہ نے یہ کافی سمجھا کہ عربی متن طلبہ کے سامنے پڑھ کر اس کا ترجمہ مادری زبان میں کر دیا جائے، آج بھی یہی حالت برقرار ہے۔(۱۹)

البتہ ڈاکٹر احمد ادریس کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی حالت اس سلسلے میں پاکستان جیسی ہی ہے، لیکن پاکستان کے عربی ادباء بہتر پوزیشن میں ہیں، وہاں عربی سیکھنے سکھانے، مطالعہ کرنے اور اس میں تحریر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

حواشی ومراجع

(۱).....تاریخ الاسلام فی شبہ القارۃ الہندیۃ: ڈاکٹر احمد السادات، ۱۹۵۷ء (۲).....ہندوستان میں عرب حکومتیں، قاضی اطہر مبارک پوری، کراچی، ۱۹۶۷ء ص:۲۲ (۳).....تاریخ الاسلام فی الہند ص:۶۷ (۴).....تمدن ہند پر اسلامی اثرات: ڈاکٹر تاراچند، اردو ترجمہ لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۵۹، انتشار العالم اسلامی: ڈاکٹر عبداللہ طرازی، جدہ ۱۹۸۵ء، ۱/۴۱ (۵).....تمدن اسلامی، ص:۷۹ (۶).....انتشار الاسلام فی العالم ۱/۴۶ (۷).....الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، دمشق ۱۹۸۳ء ص:۹ (۸).....حضارۃ الہند، عربی ترجمہ، ۱۹۴۸ء ص:۴۱۸ (۹).....سفینۃ البلاغۃ، الہند، ۱۳۱۱ھ ص:۱۲-۱۳ (۱۰).....مجموعہ سخنہائے نخستین سیمینار بیوستگیہائے فرہنگی ایران وشبہ قارۃ ج:۱ ص:۲۰۸ (۱۱).....نشوۃ السکران من صہباء تذکار الغزلان، الہند ۱۲۹۴ھ ص:۲ (۱۲).....دیوان احمد، الہند ۱۹۵۸ء ص:۱ (۱۳).....المسلمون فی الہند، ص: ۸۴، حرکۃ التالیف باللغۃ العربیۃ فی الاقلیم الشمال الہندی، ڈاکٹر جمیل احمد، کراچی ص:۵۴۔ (۱۴).....الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند، الندوی، الہند ۱۳۷۸ء ص:۱۶ (۱۵).....ہندوستان کے سلاطین، علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، الہند ۱۹۶۴ء ص:۱۱-۳۴ (۱۶).....الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص:۵۴ (۱۷).....المسلمون فی الہند، الہندوی، ص:۱۰۶ (۱۸).....نزہۃ الخواطر، الہند ۱۹۷۶ء، ۵/۳۰ (۱۹).....مجلۃ المجمع العربی الباکستانی، لاہور، العدد الثانی، نومبر ۱۹۹۳ء، ص:۲۹-۳۰

☆.....☆.....☆